انتظار حسین کے افسانوں میں رسوماتی و توہماتی عناصر

ڈاکٹر محمد مسعود عباسی ☆
Dr. Muhammad Masood Abbasi
محمد یوسف ☆☆
Dr. Muhammad Yousaf

Abstract:

Intiazar Hussain is one of the great Urdu legendary writers. Intiazar Hussain in his fiction describes the superstitions and religions found in the society according to his wishes. The subjects of Intazar Hussain are full of bigotry, zeal, and rituals- in this article author tried to gave a bird eye view on Intiazar Hussain's fiction to reach the facts of customs in symbolic ways.

سماجی زندگی میں توانائی اور تنویر کا سرچشمہ وہ پیداواری وسائل ہیں جن کے تغیر و تبدل سے ماڈی اور تہذیب رشتوں میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے اور عقائد و اعتبارات کے مفاہیم بدل جاتے لیکن اقدار کی یہ شکست وریخت بھی زندگی میں طرفگی و تازگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اور یہ احساس رجعت میں نظر آتا ہے اور انسان اپنی نظریاتی اساسوں میں جاں گزین ہوتے ہوئے خود کو پناہ دیتا ہے یا محفوظ سمجھتا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں بھی رجعت کا منظر اسی پس منظر سے اُبھرتا ہے۔

انتظار حسین کے وہ افسانے جو ہجرت کے بعد لکھے گئے ہیں اس تجربے کے براہ راست اظہار سے تعلق رکھتے ہیں اور ایسے مسافر کے ذہنی رویوں اور تخلیقی بازیافت کو پیش کرتے ہیں جو وطن سے کوسوں دور مسافرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ جس کا پردیس میں واحد سہارا ماضی کی گم شدہ یادیں ہیں جن میں گزرے ہوئے لمحات کا افسوس شامل ہے اور خوشی کے لمحوں کی بازگشت بھی اُن یادوں کا حصہ ہے۔ یادوں کا تعلق چونکہ جگہوں، آوازوں، اشیاء ورنگوں، خوشبوؤں اور خدوخال سے ہوتا ہے اور جب یہ تمام اجزاء ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں تو ایک نگارخانہ بن جاتے ہیں جہاں قوسِ قزح کے سب رنگ نظر آتے ہیں۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، جامعہ آزاد جموں و کشمیر مظفر آباد
☆☆ لیکچرار شعبہ اردو، جامعہ آزاد جموں و کشمیر مظفر آباد

چناں چہ انتظار حسین کے افسانوں میں اُن کے آبائی وطن کے گلی کوچے، سڑکیں وبازار، کھنڈر رو عمارات، مساجد وامام باڑے، کربلا اور اس پر سایہ کیے ہوئے املی کے درخت، کھیت وباغات، سازوسامان، مرد وعورت، بچے وبوڑھے، اپنے پرائے، رہن سہن، مشاغل ومراسم، رسوم ورواج، میلے ٹھیلے، مجالس وجلوس، عقائد وتصورات، توہمات وتعصبات کی مدد سے جو تصویریں بنتی بگڑتی ہیں اگرچہ اُن میں کوئی ندرت نہیں ہے لیکن چوں کہ اُن کا تعلق مصنف کی ذات، اس کی پسند وناپسند اور تاثرات سے ہے جس سے صداقت کا رنگ نکھر آیا ہے لیکن اس جزئیات نگاری میں ایک کڑی بہت اہم ہے کہ انتظار حسین نے وقت کو تجسیم کرنے اور ٹھہرانے کی سعی کی ہے اور منظر کو متحرک کرنے کی بجائے اسی ناسٹلجیا میں جینے کے آرزومند ہیں۔ انتظار حسین کی پیش کردہ تصویروں کے ٹھہرے ہوئے رنگوں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> ”رنگوں کے اس تنوع اور خطوط کی دل کشی کے باوجود تمام تصویریں جامد اور ٹھہری ہوئی ہیں۔ ان میں استدلال کا وہ تار بھی موجود نہیں ہے جو واقعات وکردار کے باہمی ربط سے تیار ہوتا ہے اور تصویر کو متحرک وزندہ بنا کر نقشِ دوام عطا کرتا ہے بلکہ تسلسل وربط کا یہ فقدان اُن کے افسانوں میں ایسے بچے کی ذہنی افتاد، نفسیاتی رویوں اور فکّری ردّعمل کی تحلیل بن کر اُبھرتا ہے۔ جسے قافلے سے بچھڑ جانے کے بعد خوف ودہشت، تنہائی اور مایوسی نے گھیر لیا ہو۔“(۱)

انتظار حسین کو ہم افسانے کا ناصر کاظمی کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان دونوں کے ہاں ایک ہی قسم کے کرب ہیں: دونوں کو حسن اتفاق سے لاہور میں ہی زیست کرنے کا سامان کرنا پڑا، دونوں پر ہجرت کا اثر ہے، دونوں پر یاسیت چھائی ہوئی ہے، دونوں اپنے سابق وطن کی یاد میں ماتم کناں ہیں، دونوں کے پاس گزشتگان کی یاد ٹھہر گئی ہے، دونوں وقت کو تجسیم کر کے پچھلے دور میں جانا چاہتے ہیں، دونوں کا ناسٹلجیا ایک ہی دھارے سے پھوٹ رہا ہے، بس اسلوب کا فرق ہے اور صنف کا افتراق ہے۔ انتظار حسین کے اس تمام فکر وفن کو اس کے افسانے ”آنجہانی کی کھریا“ کے اقتباس میں دیکھیں تو اس بات کی توثیق ہوجاتی ہے اور یاد و یاس کی تمام پرچھائیاں علت و معلول اور کرداروں سے واضح ہوجاتی ہیں:

> ” میلے سے واپسی میں راہ سے بھٹک جانے والا بچہ۔ وہ اکیلا کبوتر جو اپنی چھتری سے بہت دور کسی اونچے کوٹھے پر بیٹھا رہ جائے اور اُسے رات آلے۔ اندھیرے ہوتے ہوئے آسمان پر وہ ڈگمگاتی ہوئی اکیلی پتنگ جسے کھینچتے ہوئے ہر بار یہ محسوس کرے کہ

اب کسی درخت میں اُلجھی مرغی کا وہ بچہ جو شام پڑے آنگن میں اکیلا رہ جائے اور سارے آنگن کا بدحواسی میں چکر کاٹے مگر ڈربے میں داخل نہ ہو سکے، یہ تصویریں مجھے رہ رہ کر ستاتی ہیں۔ شاید اپنے کردار بھی اسی قسم کے ہیں۔ نہیں، بلکہ یہ مخلوقات ہی اپنے کردار ہیں۔"(۲)

حال سے مایوسی، تنہائی کے احساس اور خوف کی نفسیات نے بھٹکنے والے بچے کی یادداشت کو اس قدر قوی اور ماضی کو اس قدر قریب کر دیا ہے کہ معمولی جزئیات بھی اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے افسانوں میں جزئیات کی بھرمار ہے لیکن اُن کے فنکارانہ شعور اور سلیقۂ استعمال نے انھیں افسانوں میں عیب بننے سے بچا لیا ہے بلکہ اُن کی موجودگی افسانے کی اندرونی فضا کو روشن اور صداقت و تاثر کی فضا کو گہرا کرتی ہے۔ البتہ ماضی کی بھول بھلیاں میں کھو جانے والی جو کیفیت اُن کے افسانوں میں پائی جاتی ہے وہ حالاور مستقبل کے مقابلے میں ماضی پر مکمل اعتماد کا نتیجہ ہے جو انھیں قدامت پسندی، بنیاد پرستی اور رجعت پسندی سے رجعت پرستی تک لے جاتا ہے۔

انتظار حسین کا کہنا ہے کہ افسانے کی اصل روایت سمعی روایت ہے یعنی قصّہ کہانی کی روایت۔ اس روایت سے وفاداری کا دم بھرتے ہوئے اُنھوں نے بار بار پیچھے دیکھا ہے اور اُن تہذیبی حوالوں کو پھر سے پانا چاہا ہے جو کہیں پیچھے کھو گئے تھے۔ ہندو مسلم تہذیبی روایت قصّہ کہانی کی روایت سے جڑ کر اُس کے ہاں ایک تخلیقی قوت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ جدید تہذیب جس طرح سب کچھ فنا کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے؛ اُسے انتظار حسین کے کرداروں نے بہت تشویش سے دیکھا ہے۔ نئی حسیات کے آدمی کی بجائے تہذیبی آدمی ان کے یہاں زیادہ لائق اعتنا رہا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "گلی کوچے" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں شامل افسانہ "استاد" تقسیم سے پہلے میرٹھ میں لکھا اور وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ باقی سب افسانے لاہور کی پیداوار ہیں۔ آخری آدمی، زرد کُتا، کچھوے اور شہر افسوس انتظار حسین کو انفرادیت بخشتے ہیں۔

انتظار حسین ہر وقت ماضی میں ہی جھانکتے رہتے ہیں۔ اُن کی سوچ ہے کہ ماضی کی وہ نسل جس نے محنت اور مشقت کے بغیر حاصل کی ہوئی دولت کے سہارے زندگی گزاری تھی، کسانوں کے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو سامانِ تعیش کے لیے استعمال کیا تھا، جس کے کانوں

اور آنکھوں پر جلسے جلوسوں، نعروں، توہمات اور تعصبات نے پردے ڈال رکھے تھے۔ وہ آزادی اور مساوات کے نعرے کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے ماضی کے تجزیے و تحلیل سے کسی زندہ کردار یا صحت اقدار کے برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے اور اب جب کہ یہ رشتہ بھی منقطع ہو چکا ہے یہ خواہش اور بھی بے محل معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے افسانوں میں کوئی زندہ کردار نہیں ابھرتا اور نہ ہی کوئی ایسی تصویر تشکیل پاتی ہے جس کے بطن سے حال اور مستقبل کی زندہ اور توانا روایت کے نقوش اُبھرتے ہوئے نظر آئیں ہاں اگر کچھ ہوتا ہے تو صرف یہ:۔

> "پٹن کی ماں کو کون سمجھائے کہ اُسے عطائیوں سے تریاچلتر کے قصّے سننے کا چسکا پڑ گیا ہے۔"(۳)

عقل و دانش نے رجعت پسندی کے وجود کو خطرے میں ڈال دی ہے۔ زندگی کی نئ اقدار اور آثار کے تقاضوں نے جاگیردارانہ نظام کے طلسم، تقلید وروایت پرستی، جبر و محکومی، توہمات وتعصبات کو ہی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا بلکہ قدیم فلسفہ و فکر، اقدار، لفظیات اور علم الکلام کو ہی فرسودہ قرار دے دیا ہے جس کے باعث شہر کے باشندے انتظار حسین کو گونگے اور بہرے معلوم ہوتے ہیں اور رجعت پسند طبقے کے نمائندے سید علی الجزائری کو اپنی بات سمجھانے کے لیے قبرستان کا رخ کرنا پڑتا ہے اور یہاں وہی ایک طلسماتی فضا نظر آتی ہے جس کا تعلق مذہب سے بھی اُتنا ہی ہے جیسے:

> "وہ (علی الجزائری) قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا اس کا عجیب اثر ہوا۔ قبروں سے درد کی صدا بلند ہوئی۔ تب سید علی الجزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا۔۔۔ اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو، جیتے لوگ بہرے ہو گئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔"(۴)

انتظار حسین کے ہاں ایک ہی کہانی ہے جو بار بار نئے کرداروں کے ساتھ دہرائی جارہی ہے۔ ان کی کہانیاں ایک کنونشن سے برآمد ہوتی ہیں۔ اس تعلقہ میں ایک ہی عورت، ایک ہی سماج، ایک ہی مایوسی اور ایک ہی منظر ہے۔ بس نام اور کرداری پیکروں کے منطقے اور جغرافیے الگ ہوتے ہیں۔ یہ جغرافیہ قاری کو دھوکا دینے کے لیے ہیں اور نام بھی قاری کو بور ہونے سے بچانے کے لیے ہیں کہ یکسانیت کا گمان نہ ہونے پائے مگر قاری کو خبر ہے "دشمن کے ہر ارادے کی۔" کرداروں کے

اوپری چولے بدلے جاتے ہیں مگر اندر کا چھپا انسان ایک ہی ہے۔ جو کھویا ہوا ہے۔ جو ہجرت کا شاکی ہے جس کے پاس یادیں ہیں جو یہ سوال کرتا ہے:

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے، کیا ہوئے(۵)

انتظار حسین کا سارا فن یہی ہے کہ وہ ایک لمحے کا قیدی ہے جو کہ گزرتا ہی نہیں اور اُس لمحے میں موجود تمام رسوم، تمام توہمات اور تمام پیکر اپنے علامتی روپ بدلتے ہیں مگر منظر کی ساختیات نہیں بدلنے پاتی۔ اُن کے مناظر میں اکثر قصّہ گو پائے جاتے ہیں جو حقے کی نڑی پر ہاتھ جمائے ہوئے ہر کسی کی بات پر ٹکڑا لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کے افسانوی تکیہ کلام ہوں۔ اُن کے ہاں مذہب، رسوم، ثقافت اور اساطیر کا ایک ہی دائرہ ہے اور سب ایک دوسرے سے پیوست ہیں مثلاً اُن کا افسانہ ''قدامت پسند لڑکی'' میں ہمیں یہ رنگ اس طرح نظر آتا ہے:

''صادقہ زین العابدین نے آدرے ہرن کی طرز پر اپنی زلفیں ترشوائی تھیں عاشورہ کے دن وہ ان زلفوں میں کنگھی نہیں کرتی تھی اور کالا لباس پہنتی تھی۔ کالے لباس پر دوستوں نے اُنگلیاں اُٹھائیں تو سید حسن رقیق القلب ہو گئے اور بولے: ''محرم میں کالی قمیض پہننا مذہب نہیں ہے کلچر ہے۔''(۶)

انسانی محبتوں کے تواتر میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی آتے ہیں جو معاشرے میں رسم کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ انھی رسموں میں ایک رسم اپنے کھوئے ہوؤں کی اشیاء کو نہ کھونے دینا بھی ہے جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُس خاص فرد کو ہم کھونا نہیں چاہتے تھے اور اُس کی یادوں کے تسلسل میں اُس فرد کو تجسیم کیے جاتے ہیں ایسا ہی منظر انتظار حسین دکھاتے ہیں:

''انجنیئر صاحب پھر اکیلے رہ گئے۔م بہت دکھی رہتے تھے۔ بچارے بالکل کھوئے ہوئے رہنے لگے تھے۔ نوکری سے بھی جی اُچٹ گیا تھا۔ اب دورے پہ بھی ایسے ویسے ہی جاتے تھے۔ بس اسی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز کو گیند اور بلے کو سنبھال کے رکھ چھوڑا تھا۔۔۔''(۷)

رسم و رواج کے دو دھارے ہیں۔ ایک دھارا جو ماضی کی طرف بہتا ہے اور دوسرا دھارا مستقبل کی طرف بہتا ہے۔ اِن دو دھاروں کا سلسلہ دو گرہوں دے جڑا ہے۔ ایک گروہ قدامت

پسند کہلاتا ہے دوسرا اگروہ روشن خیال کہلاتا ہے۔ اِن دونوں گروہوں کے افراد کو ایک دوسرے کی رسم ورواج دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ تحیر ہی معاشرے میں ایک خاص طرز کے مدوجزر کو جاری رکھتے ہوئے عدم یکسانیت کے رنگ کو جنم دیتا ہے۔ جس سے زندگی کا حسن اور دل کشی برقرار ہے۔ اسی طرز معاشرت میں رسموں ورواجوں کے دونوں رنگ ایک ساتھ انتظار حسین کے افسانے ''اسیر'' میں نظر آتے ہیں:

''آئس کریم کھاتے کھاتے جاوید کی نظروں نے اُس لڑکی کا تعاقب کیا جو فلیپر پہنے بڑے بڑے گول شیشوں کی عینک لگائے نمودار ہوئی تھی اور اس وقت تک تعاقب جاری رکھا جب تک وہ اندر داخل نہیں ہوگئی۔'' یار انور! ادھر میرے پیچھے بیل باٹم توغائب ہی ہوگیا''۔ ''اور چست پتلون بھی۔''، '' چست پتلون بھی اور چست قمیض بھی۔۔۔۔یار انور! تم بتایا نہیں کہ یہاں کیا ہوا''۔ '' جو ہوا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔'' انور نے آئس کریم کھاتے ہوئے طنز کے لہجے میں کہا'' بیل باٹم رخصت ہوگیا، فلیپر آگیا۔'' تم اِسے چھوٹا واقعہ سمجھتے ہو؟''(۸)

رسوم ورواج کا دھارا صرف اس خاص پہلو میں نہیں بہتا بلکہ رسوم کا ایک پہلو اس سے بھی زیادہ حد تک منفی ہے جس کا اظہار انتظار حسین نے اپنے افسانے ''صبح کے خوش نصیب'' میں کیا ہے۔ جہاں ماں کا بچے کو دودھ پلانے کا انداز اور اس رسوم ورواج کو خاص جگہ پر پیش کیا ہے اور اس خاص جگہ (ٹرین) پر اس کے ساتھ ایک اور مردانہ رسم کا مظاہرہ بھی ملتا ہے جسے پڑھ کر موپساں کا افسانہ ''Idyle'' یاد آجاتا ہے:

''سامنے کی نشست پر بیٹھی عورت نے گود کے بچے کو پہلے خالی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ وہ نہ مانا اور سینے پر دست درازی کرنے لگا تو اس نے قمیض کا دامن اُٹھا کر بچے کا مُنہ اندر کیا اور دامن گرالیا۔ قمیض کا دامن اُس نے اتنی چابک دستی سے اُٹھایا کہ پیٹ کے ایک بے معنی سے گوشے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خیر اس سے اتنا تو پتہ تو چل ہی گیا کہ اس ملگجے لباس کے اندر کتنا روشن بدن چھپا ہوا ہے۔''(۹)

رسوم ورواج کا تعلق کبھی ثقافت سے ہوتا ہے تو کبھی مذاہب سے۔ مذاہب سے منطبق رسموں میں جذباتی پن کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ جذباتی وابستگی معاشرے میں ایک خاص رنگ بھی پیدا کرتی ہے اور اس سے اجتماعی شعور اور لاشعور کو استوار بھی کیا جاتا ہے۔ اس خاص کیفیت میں خاص کام بھی کیے جاتے ہیں جس کو افسانے ''کانا دجال'' میں انتظار حسین نے یوں لکھا ہے:

"اللہ بخشے بڑی اماں نے میرے لیے سونے کے کڑے بنوائے تھے، پھر طرابلس میں لڑائی چھڑ گئی، سارے مسلمان دہل گئے۔ ظفر علی مولوی آیا، پھر خلافت والا مولوی آیا، پھر انھوں نے کہا کہ ماؤ، بہنو! مسلمانوں پر کڑا وقت آ پڑا ہے، اپنے اپنے زیور اُتار دو، میں نے روتے روتے اپنے کڑے دیے اور مولوی کو دے دیے اور پھر میں مہینے بھر تک اُلٹی چارپائی پر سوئی۔"(۱۰)

انتظار حسین کا افسانہ مسلم تاریخ معاشرت کا ایک مرقع ہے اور وہ باتیں وہ رسمیں وہ عقیدے جو ایک خاص دور تک اس معاشرے کی زینت رہے اور اب معدوم ہو چکے ہیں؛ اُن کو ضبطِ تحریر میں لا کر وقت کی فراموشی سے بچا لیا ہے اور یہ بجا طور پر ایک بڑا اہم کام ہے اسی طرز کی ایک معدوم روایت کو انتظار حسین افسانہ "کانا دجال" میں بیان کرتے ہیں:

"ہندوؤں میں بارتیں ان دنوں کتنی چڑھتی تھیں۔ ادھر بارات کے تاشے باجے کی آواز آئی اور اُدھر وہ سٹکا اور ادھر اماں گھبر اُٹھیں، پھر دروازے سے نکلتے نکلتے اُسے پکڑا۔ دروازہ بند کر کے اُسے اندر لائیں: "ڈوبے بخت مارے! تو دجال کا لشکری بنے گا؟"(۱۱)

انتظار حسین کی ایک یہ خوبی ہے کہ اس نے جب توہمات کا ذکیا ہے تو اُس میں بلا تخصیص ہر فرقے اور ہر نسل کو صاف لفظوں بیان کیا ہے اور اس کی زد میں اپنا آپ بھی آنے سے نہیں بچایا اور یہی ایک بڑا پن ہے جو فوقیت فراہم کرتا ہے اور اسی معیار پر کسی انسان کو پرکھا جاتا ہے۔ وہ مذہب کو توہمات سے الگ گردانتا ہے اور توہمات کا ذکر بے باکانہ کرتا ہے۔ اس کے افسانہ "قدامت پسند لڑکی" میں انتظار حسین کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو:

"سیّد حسن سوز پڑھ کر روئے اور بولے کہ " ذوالجناح اور عَلم صلیب سے بڑے سمبل ہیں پتا نہیں ہمارے پینٹر ان سے کیوں متاثر نہیں ہوئے؟" اشرف نے کہا، کہ پچھلے ایک سال سے مستقل مسلمانوں کی متھ کا متلاشی تھا۔ یہ سنا اور متاثر ہوا اور قمیض اتار کر ماتم کیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ اگلے برس وہ بھی کالی قمیض پہنے گا مگر چوں کہ چند ہی ماہ بعد مارکیٹ میں نئی کتاب آ گئی اور اشرف کو یونگ سے چند در چند اختلافات ہو گئے اس لیے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔"(۱۲)

مذہب کو جب اپنے نظریات کے تحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور من چاہے نتائج کی خواہش ہوتی ہے تو اس سے بھی توہمات جنم لیتی ہیں۔ اور توہمات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے

کہ ہر انسان کو من چاہے نتائج نہ ملنے پر مذہب سے بیزار کو دیتی ہیں۔ اس لیے انتظار حسین نے اس کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری نتیجہ خود اخذ کرے اپنے افسانے ''ہندوستان سے ایک خط'' میں لکھتے ہیں:

''اپنے بازو سے دُعائے نور کھول کر اس کے بازو پر باندھی اور اللہ کی حفظ وامان میں اُسے رخصت کیا۔ چلتے چلتے تاکید کی تھی کہ سرحد سے نکلتے ہی جس طرح بھی ہو خیریت کی اطلاع دینا۔ مگر وہ دن ہے اور آج کا دن، خیریت کی خبر نہیں ملی۔''(۱۳)

انسان کا انفرادی احساسِ تفاخر اور خبطِ عظمت اُسے دوسروں کی نظروں میں قطعی بڑا نہیں کرتا بلکہ صرف ایک خاص مرعوب طبقہ اس سے اثر لیتا ہے مگر یہ احساسِ تفاخر کیوں کہ ایک بڑے عرصے تک مروج رہا ہے اس لیے انتظار حسین نے سید ہونے کے احساسِ برتری کو اُجاگر کیا ہے کہ سید اپنے آپ کو کس حد تک ممتاز کرتے ہیں اور اپنے شجرہ نسب کی حفاظت کس طرح کرتے ہیں اور اسی شجرۂ نسب کی بنیاد پر لوگوں پر اپنی حاکمیتِ روحانی ونسلی کی دھاک بٹھاتے ہیں اور اپنے ہاں کوئی نہ کوئی فوق الفطرت شئے کا ہونا اپنی برتری کا نشانی کے طور پر پیش کرتے ہیں جیسے کہ خاکِ شفا کی تسبیح جو عصرِ عاشور کو سرخ ہو جاتی ہے؛اس سے اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنا اور پھر اپنے آباء کی درباروں کا ذکر کر کے اُن کریڈٹ خود وصولتے ہیں۔ ایسے ہی ایک طبقے کی ایک منظر سے ''ہندوستان سے آخری خط'' میں روشناسی ہوتی ہے:

''ہمارے مورثِ اعلیٰ میر منصور محدث۔۔۔ اکبر آباد میں اُن کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے قبر کچی ہے۔ کنواریاں مٹی اٹھا کر مانگ میں ڈالتی ہیں جو برس کے اندر اندر مانگ کو سیندور بن جاتی ہے۔ خالی گود بیاہیاں مٹی آنچل میں باندھ کر لے جاتی ہیں اور برس بعد ہری گود کے ساتھ واپس آتی ہیں اور چادر چڑھاتی ہیں۔''(۱۴)

نسلی تفاخر کی سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ سید ہونے کا ایک خاص شرف نسبت پیغمبرؐ ہے مگر اُن کے ساتھ ساتھ اُن کو سیادت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس برتری اور برہمن ازم سے وہ اپنے مقاصد کشید کرتے ہیں۔ ہر غیر سیّد برادری کی عورت اُن کے سامنے حقیر و ذلیل ہے اور اُس کے ساتھ جو سلوک کریں وہ جائز ہے۔ اُن سے شادی رچا کر اُن پر احسان بھی کیا جا سکتا ہے مگر اپنی بیٹی اِن غیر سیدوں پر حرام ہے اور جب اپنی بیٹی ان توہمات سے آزاد ہو جائے تو اُس کا درد برداشت نہیں ہوتا۔ اسی تنگ نظری کو انتظار حسین یوں لکھتے ہیں:

''چھوٹا بھیا مرحوم کی صاحب زادی خالدہ نے ایک ہندو وکیل سے شادی کر لی ہے۔ اب وہ بے حجابی سے ساڑھی باندھتی ہے اور ماتھے پر بندی لگاتی ہے۔ پاکستان میں جو خاندان کا نقشہ ہے وہ تم پر مجھ سے زیادہ روشن ہونے چاہیے۔ سنا تھا کہ آپا جانی کی لڑکی نرگس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے اور جس سے کی ہے وہ وہابی ہے۔ خود آپا جانی کا حوال میں نے سنا ہے کہ وہ کھلے مُنہ بیٹے کی موٹر میں بیٹھتی ہیں اور ہزاروں سے منہ در منہ بات کر کے کپڑا خریدتی ہیں۔''(۱۵)

جب معاشرہ مذہبی توہم پرستی کی انتہاؤں پر آجاتا ہے تو اس کے پاس عقلیت ختم ہو جاتی ہے۔ توہم پرستی خود فریبی کا نام ہے اور اسی سے پھر انتہا پسندی اور شدّت پسندی پھوٹتی ہے۔ اس کے زیر اثر طاقت ور اور اکثریت والے اپنا تحکم بر قرار رکھنے کے لیے اقلیتوں پر جبر مسلط کرتے ہیں اور اقلیتوں کو جینے کا حق دینے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ اسی فسانے کو انتظار حسین افسانے میں یوں ڈھالتے ہیں:

''خبر سنی ہے کہ مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ شیخ صاحب کو میں نے یہ خبر سنائی تو وہ اپنا سا مُنہ لے رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان پر اپنی رحمت کرے اور اس قوم کو اس نیکی کی جزا دے۔ ہم تو کفرستان میں ہیں۔ غیر اسلامی رسوم و اطوار رکھتے ہیں اور بول نہیں سکتے۔ ہماری حویلی سے قریب ہی غیر مقلدوں نے اپنی مسجد بنالی ہے۔ وہاں بلند آواز سے آمین کہتے ہیں اور ہم چپ رہتے ہیں۔''(۱۶)

نام نہاد مذہبی روش جس میں رہبانیت موجزن ہے؛ اس کا حوالہ بھی توہم پرستی میں آتا ہے۔ ایک خاص طرز میں مصلیٰ بچھا کر تسبیح وورد کرتے رہنا اور حرکت نہ کرنا کہ غیبی امداد آگئی۔ اس قسم کے مناظر نے ایک الگ دنیا بسالی ہے جہاں خود کوئی کام نہ کرنا بلکہ خدا کے اوپر چھوڑ کر کسی معجزے اور کرامت کا انتظار کرنا ہی سب کچھ عقیدے کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔ ہجرت کے منظر میں ایک ایسا ہی منظر انتظار حسین نے دکھایا ہے۔ اُن کے افسانے ''وہ جو کھوئے گئے'' میں جہاں ایک بیٹا روداد سنا رہا ہے:

''ہم باہر نکل رہے تھے، بھاگ رہے تھے۔ نوجوان کا دل بھر آیا، بولا: '' مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اُس وقت میرا باپ جانماز پر بیٹھا تھا اور ہاتھ میں اس کے تسبیح تھی، ہونٹ اُس کے ہل رہے تھے اور گھر میں دھواں ہی دھواں تھا۔''(۱۷)

توہم پرستی کی جڑیں برصغیر میں بہت گہری ہیں اور اس حد تک گہری ہیں کہ یہاں کے باشندے کھلی آنکھوں سے مناظر دیکھتے ہیں اور ذود یقینی کی معراج پر رہتے ہیں۔ اگر کسی ایک فرد نے کسی بھی طرز کی کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے عقیدت اور فوق الفطرت بات جھلکتی ہو تو اُس پر یقین کرنا اپنا فرض اولین گردانتے ہیں۔ اس واقع اور منظر کو دوسرے واقع کے ساتھ جوڑنا ہی مذہب سمجھتے ہیں۔ ایسا ایک واقعہ انتظار حسین نے افسانے ''کٹا ہوا ڈبہ میں'' سنایا ہے:

> ''اور وہ بزرگ کہاں گئے؟ بندو میاں نے حیرانی سے سوال کیا۔ ''اللہ بہتر جانتا ہے کہ کہاں گئے؟'' شجاعت علی کہنے لگے۔ '' بس وہ کوراگھڑا اسی طرح رکھا تھا مگر پانی اس کا غائب ہو گیا تھا''۔ شجاعت علی کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے سرگوشی بن گئی''۔ والد صاحب فرماتے تھے: اس کے اگلے برس غدر پڑ گیا۔۔۔ جمنا میں آگ برسی اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔''(۱۸)

اسی توہم پرستی کا ایک اور پہلو خوابوں کا جہان اور اس سے کشید کردہ خود ساختہ تعبیریں ہیں جس سے انسان کا جڑ جانا، اس کے ذہنی عمل کا وقوع پذیر ہونا، اس کی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ مزاجی کا پتہ دیتا ہے۔ خوابوں کا دیکھنا اور اس کو یاد رکھنا اور پھر اس کی کسی تقدیر شناس سے تعبیر لینے کا عمل انسانی عظمت کے اوپر ایک سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ انسان جس انسان سے تعبیر پوچھ رہا ہوتا ہے وہ بذات خود اپنی الجھنوں کو سلجھا نہیں پاتا۔ اس توہم پرستی کو مذہب کے فروعات کے ضمن میں انتظار حسین نے اپنے افسانے ''سیڑھیاں'' میں یوں دکھایا ہے:

> ''مردے کو دیکھنا برکت کی نشانی ہے۔ عمر زیادہ ہوتی ہے مگر۔۔۔ یہ۔۔۔؟ اختر کچھ جھجک گیا۔ ''ہاں! اس کی صورت ذرا مختلف ہو گی''۔ بشیر بھائی اپنے لہجے سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔ ''مردے کو ساتھ ساتھ کھاتے دیکھنا کچھ اچھا نہیں۔۔۔ کال کی نشانی ہے''۔ بشیر بھائی چپ ہوتے ہوتے پھر بولے، اور اب کے قدرے بلند آواز میں: مگر تمھیں تو وقت کا پتا نہیں۔ بے وقتے خواب پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ احتیاطاً صدقہ دے دو۔''(۱۹)

مذہبی عقیدت میں بنائے گئے نئے نئے عقیدے اُس وقت تک اپنا فسوں جمائے رکھتے ہیں جب تک اُس چیز کی حقیقت نہ سامنے آ جائے۔ میر انیس و دبیر نے سورج کو مغرب میں اس لیے ڈوبتا دیکھا کہ وہاں نجف میں مزارِ علیؓ ہے اور یہ سورج وہاں سے ضیا لے کر اگلی صبح مشرق سے طلوع ہوتا ہے یہ حسنِ تعلیل نہیں اُن کے عقیدے کا اعلان ہے۔ اسی طرح آسمان پر بکھری کہکشاں کو بھی

ایک عقیدے سے باندھا گیا ہے۔ اس بات کو انتظار حسین نے "کانا دجال" میں اسی انداز میں بیان کیا ہے جس طرح یہ توہم پرستی اپنے معنوں میں رائج تھی:

"تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے اُسے لگا جیسے ایک پگڈنڈی ہے جو دور تک چلی گئی ہے اور پگڈنڈی پر تارے پسے ہوئے پڑے ہیں۔ یہ کہکشاں ہے اور کہکشاں کے خیال سے اُسے بڑی اماں کا خیال آیا۔ جب بڑی اماں زندہ تھیں اور وہ بچہ تھا: "یہ ہمارے حضورؐ کے گھوڑے شریف کے سموں کی دھول ہے"۔ "آسمان پر گھوڑا گیا تھا؟"، "ہاں بیٹا! معراج شریف تو ساتویں آسمان پہ ہے۔ حضورؐ گھوڑے پہ بیٹھ کے آسمانوں سے گزرے تھے۔"(۲۰)

یوں انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں معاشرے میں پائے جانی والی توہم پرستی اور مذہب کو اپنی خواہشات کے مطابق بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی رنگ کو بیان کرتے ہوئے تفرقانہ انداز میں کچھ لوگوں کی دل آزاری کا سبب بھی بنے ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں تو مصنف کے ہاں مل جائیں گی لیکن مجموعی طور پر انھوں نے معاشرے کو گہرائی سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ ایک اچھا افسانہ نگار ایسا ہی ہونا چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ عظیم الشان صدیقی،ڈاکٹر،افسانوی ادب: تحقیق و تجزیہ،نیو پبلک پریس،دلی،۱۹۸۳ء،ص ۱۷۰

۲۔ انتظار حسین،کنکری،مکتبۂ جدید،لاہور،۱۹۵۵،ص ۱۷

۳۔ انتظار حسین،جنم کہانیاں،سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور،سن ندارد،ص ۶۱۲۔۴۷

۴۔ ایضاً،ص ۴۲۰

۵۔ ناصر کاظمی،کلیاتِ ناصر،مکتبۂ خیال لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۱۳۸

۶۔ انتظار حسین،کچھوے،مطبوعات،لاہور،۱۹۸۱ء،ص ۱۲

۷۔ ایضاً،ص ۴۰

۸۔ ایضاً،ص ۴۹

۹۔ ایضاً،ص ۱۳۵

۱۰۔ انتظار حسین،شہر افسوس،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء،ص ۱۱۲

۱۱۔ ایضاً،ص ۱۱۹

۱۲۔ انتظار حسین،کچھوے،مطبوعات،لاہور،۱۹۸۱ء،ص ۱۳

۱۳۔ ایضاً،ص ۵۷

۱۴۔ ایضاً،ص ۶۱

۱۵۔ ایضاً،ص ۵۹

۱۶۔ ایضاً،ص ۵۸

۱۷۔ انتظار حسین،شہر افسوس،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء،ص ۱۱

۱۸۔ ایضاً،ص ۳۱

۱۹۔ ایضاً،ص ۵۱

۲۰۔ ایضاً،ص ۱۱۸